ترجمہ

تقسیم (پرگیہ)

ترجمہ: حفیظ بن عزیز

یہ شہر بھی عجیب ہے نا انوکھے؟ میں اور تو انہیں لاکھ گالی دے دیا کریں روز، لیکن کیا ان کے بنا تیرے میرے جیسوں کا کوئی گزارا ہے، بول؟ کتنے سال گزر گئے ہم دونوں کو یہاں آئے۔ اب تو یہ ہی دوسرا گھر بن گیا ہے ہمارا۔ ہم رہتے یہیں ہیں، کماتے کھاتے یہیں ہیں، یاری دوستیاں بھی تو اب یہیں ہیں بس ایک کنبہ ہی تو گاؤں میں ہے۔ یاد ہے نا شروع شروع میں دِل کیسا تڑپتا تھا کہ تھوڑے پیسے جوڑیں اور بھاگ لیں اپنے گاؤں۔ مجھے تو یہاں بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ آج سے کئی سال پہلے جب آیا تھا تو یہی کوئی سولہ سترہ سال کا کنوارا تھا۔ بس پوچھ نہ ایسا لگتا تھا کہ کوئی ریلا بہہ رہا ہو شہر میں۔ ریلا بھی کیسا کہ بس سب ایک دوسرے کو بنا پہچانے بھاگے جا رہے ہوں۔ ہر وقت امی کا چہرہ یاد آیا کرتا اور کھانے کے نام پہ تو آنسو ہی پھوٹ پڑتے۔ ایک کمرے میں ہم چار پانچ لڑکے۔ نہ قاعدے کا بچھونا، نہ کھانا۔ پانچ لوگوں کے کپڑوں برتنوں سے بھرا ایک ذرا سا کمرہ۔ مجبوری بھی جو نہ کرائے کم ہے۔ گندی سی بستی، بج بجاتی نالیاں۔ اب تو پھر بھی موٹر کی آسانی ہوگئی ہے نہیں تو پہلے دو ایک نل، بس وہیں نہانا - پانی بھرنا۔ دنیا بھر کی گندگی اور شور شرابا، آئے دن کے لڑائی جھگڑے۔

''تو اب کیا سب ختم ہو گیا ہے؟ گندگی کے ساتھ لڑائی جھگڑے تو اور بڑھے ہیں بستی میں۔ مرد -عورتیں کتوں کی طرح لڑتے ہیں یہاں۔ نہ جانے کون سے ہیرے موتی جڑے ہیں، جو سب چِپکے ہیں یہاں سے؟''

جمیل کو انوکھے کی آواز سنائی ہی نہیں پڑ رہی تھی۔ بس ہونٹ ہلتے دِکھ رہے تھے۔ اُس کا ذہن ماضی کے گلیارے میں جو ایک بار داخل ہوا تو وہ نہ جانے گزشتہ کتنے برسوں کی یادوں میں کھو گیا۔

''مجھے نہیں جانا شہر اماں۔ یہیں پھیری لگا لوں گا میں بھی ابا کی طرح۔ منع کر دے تو اُن سے۔ پہلے بھی خالو کے کام میں کیا کیا نہ سننے کو ملا تھا، بھول گئی تو۔

نہ جمیل، میرے بس کی نہیں ہے اُن کو سمجھانا۔ سمجھدار ہو کے کیسی باتیں کرتا ہے تو۔ دیکھتا نہیں

یہاں کیا کمائی ہے۔جن کے پاس موقع کی زمینیں تھیں وہ سب ہائی وے نکلنے سے اچھے دام کما کر شہر چلے گئے۔اُن کے رہتے کام دھندا ٹھیک چلتا بھی تھا اب پھیری کے کام میں وہ بات کہاں رہی؟ کوئی دن ٹھیک بیت بھی گیا تو پھر کئی دن کے فاقے۔اور پھر کوئی زمین نہیں ہے ہمارے پاس جو کاشتکاری کر کے کمائیں کھائیں۔جانتا نہیں ہے رے تو، دُکھی بیماری، بیاہ شادی زندگی کے سب طور طریقے نبھانے پڑتے ہیں۔ اس کمائی میں دو پیسے بچانا تو دور کھانا مل جائے بڑی بات ہے۔نہیں.....آج نہیں تو کل تجھے جانا ہی پڑے گا۔میں کچھ نہ کہوں گی اُن سے۔

''اتر پردیش میں کھتولی کے پاس ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا تھا جمیل۔نہ پڑھا لکھا اور نہ ہی زمین جائداد والا۔اسے تو مفلسی میں بیتا بچپن بھی بڑا شاندار لگتا تھا۔دماغ میں ابا کی جیب کی ذرا بھی فکر نہیں تھی، بس دل میں ایک جوش وولولہ، سارا دن طرح طرح کے کھیل تماشے اور تالاب میں ڈبکیاں۔ذرا بڑا ہوا تو ابا کے ساتھ پھیری پر جانا اور وہاں بھی مستی۔گھروں سے نکلے پرانے کوڑے کباڑ سے اُن کے دن جگمگائے رہتے۔پرانے کپڑے، جوتے، برتن، کاغذ، پلنگ کی پیوند لگ لگ کر گھس چکی نواڑیں، لوہا لکڑی اٹھانے، بورے میں بھرنے میں ابا کی مدد کرتا تھا جمیل۔اُنہیں بکوانے قصبے میں جاتا اور پھر وہاں سے آ کر اپنی پُلیا پر۔بڑے ہوتے ہی یہ پُلیا اس کی جنت ہوگئی تھی، جہاں اشرف، یوسف، اُمیش اور رام پھل کے ساتھ اس کی محفل جمتی۔دنیا بھر کی ڈینگیں، ہنسی مذاق، دل کے چھپے راز کی ساجھے داری، ساتھ جوان ہو رہی لڑکیوں کے قصے اور مستقبل کی زندگی کے سنہرے خواب۔گھنٹوں گھنٹوں یہ پُلیا ان کے خوابوں سے آباد رہتی۔آپس میں لڑتے بھی تھے پر جلدی صلح بھی ہو جاتی۔

اس بار اماں ابا پورا من بنا چکے تھے جمیل کو شہر بھیجنے کا۔بس رحمت چاچا کا آنا باقی تھا اس بار، جیسے ہی آئیں جمیل اُن کے حوالے۔اماں کے مائکے کے رحمت چاچا کئی برسوں سے دلی میں بسے ہوئے تھے۔اُن کے آنے میں ابھی وقت تھا۔اِدھر کچھ وقت سے گاؤں میں عجیب سی حرکت دکھائی دے رہی تھی۔ اچانک گودھرا۔گجرات کا شور بڑھ رہا تھا۔ٹھیک ویسے ہی جیسے کئی سال پہلے مچا تھا۔

تب رام مندر بننا تھا اور رام مندر بنانے کی زمین کے لئے بابری مسجد توڑی جانی تھی۔ہندوؤں نے ایک روپیہ، ایک اینٹ کی فرمائش کر دی تھی گاؤں بھر میں۔کارسیوا کے لئے چندے اور لوگ مانگے جانے لگے تھے۔گاؤں کے کتنے نوجوان اُس ریلے میں شامل ہوئے اُس دفعہ۔اس بار بھی شور ویسا ہی تھا، ماحول میں

سنسنی پھیلی تھی۔

''بدلہ تو ہم لے کے رہیں گے، چھوڑیں گے نہیں، سمجھ کیا رکھا ہے؟'' اُمیش بڑے پُر اعتماد لہجے میں بولا۔

اخبار اور ٹی-وی کی خبریں گاؤں بھر میں پھیل چکی تھیں اور خبروں پر سوار زلزلہ گاؤں میں داخل ہو گیا۔ گاؤں میں ہندو مسلمانوں کی تعداد برابر تھی لیکن ملک میں کس کا پلڑا بھاری ہے ہر کوئی جانتا تھا۔ اور اسی بیچ ہندو نوجوانوں کو اپنا ملک اور اپنا مذہب بچانے کے راستے پر ڈال دیا گیا تھا۔ ان میں سے کئی بھٹکے نوجوان اپنے بچپن کے دوستوں سے ملک میں رہنے اور وطن پرستی کی قیمت ادا کرنے کی بات کرنے لگے۔ اُس دن جمیل، یوسف سے بھی اُمیش اسی حق سے بات کر رہا تھا۔ جمیل اور یوسف کے لئے پُلیا پر ایک لمحہ بیٹھنا بھاری ہو گیا۔ ایک خوفناک سناٹا طاری تھا وہاں۔ اُس سناٹے میں اُمیش کسی بہادر کی طرح اپنا جلوہ بکھیر رہا تھا۔ رام پھل پریشان تھا اور جمیل و یوسف بے وجہ ہی کٹھہرے میں کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ یہ پرکاش، اندھیرے کو خوفناک بنا کر اور سیاہ کر رہا تھا۔ اُس دن تو رام پھل نے کسی طرح قصہ ختم کروا دیا لیکن اُمیش کی اکڑ برقرار تھی۔ آج صلح کا راستہ ندارد تھا۔

گھر لوٹتے وقت جمیل نے محسوس کیا کہ یہ تعصب کا سایہ اُس کے پیچھے چلا آیا ہے۔ گھر پہونچا تو خالہ اور خالو آئے ہوئے تھے۔ خالہ نے اُسے دیکھتے ہی گلے لگا کر ماتھا چوما، شمشیر خالو کی گرجدار آواز میں قصے جاری تھے۔ خالو زبردست قصہ گو تھے، گاؤں سے جانے کے بعد بھی اُن کا رسوخ قائم تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اُن کو بڑی عزت دیتے تھے۔ شمشیر جہانگیر آباد چلا گیا تھا اپنے کنبہ کے ساتھ۔ اُس کا بڑھئی گیری کا دھندا وہاں جم گیا تھا۔ پہلے تو وہ صرف ایک کاری گر تھا لیکن اب سالوں محنت کے بعد چھوٹے موٹے ٹھیکے بھی ملنے لگے تھے۔ ایک بار جمیل کو بھی اپنے

ساتھ لے گیا تھا لیکن اُس سے تو آری ہی نہیں سنبھلی۔ شمشیر اُسے روز ساتھ میں کام پر لے جاتا۔ جمیل کو بیٹھا بھی دیتا۔ جمیل اُٹھائی دھری کے کام تو کر دیتا لیکن لکڑی نہ چیر پاتا۔ مالک جب اُسے بیکاری کرتے دیکھتا تو اُس کا بھی پارا چڑھ جاتا۔ حقارت کی نظر ہی نہیں، تحقیر آمیز جملے بھی جب آزادی پا گئے تو جمیل کا دانہ پانی وہاں سے اُٹھ گیا۔ اس کام میں من نہیں لگا جمیل کا۔

کھانے کے بعد خالو نے بھی بابری مسجد کی بات چھیڑ دی۔

ووٹ کی سیاست میں اب تک پسے جا رہے ہیں بھیا۔ مسلمان ہونے کا قرض چکاؤ اور چُپ رہو، یہی تو سکھایا جا رہا ہے نا۔ ہم کچھ نہ بولیں تو دیش کے وفادار اور بولیں تو پاکستانی۔ کون ہیں یہاں پاکستان کا ذرا بتاؤ؟ ہمارے، تمہارے باپ دادا تو اسی مٹی کے رہے اور بتاؤ ہم نے تم نے کبھی دیکھا ہے پاکستان؟ کبھی جانے کی سوچی ہے وہاں؟ چارپائی پر اوندھے لیٹے خالو، ابا سے بولے۔

''اور مسجد تو اللہ کا گھر ٹھہرا پھر اُسے کیوں توڑا تھا انھوں نے؟ سینتالیس کے تقسیم کئے آج بھی الگ ہی پڑے ہیں ہم۔'' ابا کے سوال میں چھپے ڈر کو پہلی بار جمیل نے محسوس کیا۔ لیکن تقسیم کی بات جمیل کو کچھ زیادہ سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ سوچنے لگا ''سن سینتالیس..... کتنے برس ہو گئے ہونگے، چالیس۔ پچاس یا اس سے بھی زیادہ پر تقسیم... بٹوارا...؟... اور آج... آج کیوں تقسیم کی بات کر رہے ہیں ابا؟ اُمیش کی آج کی بات سے پہلے تو مجھے رام پھل اور اُمیش اپنے سے الگ نہ لگتے تھے، مجھے کیوں نہیں دِکھا یہ بٹوارا؟

''حق کی لڑائی ہے بھائی، ورنہ ہمارے گاؤں کی مزار پر ہندو منّت نہیں مانتے، دھوپ-اگربتی نہ جلاتے؟ بابری مسجد کے واقعہ کے بعد بھی۔ اتنے سالوں میں ہوا یہاں کوئی جھگڑا تمہارے دیکھے؟ اور وہاں جہانگیر آباد کی ہی سن لو جب سے گیا ہوں سب ٹھیک ہی چل رہا تھا کوئی جھگڑا نہ تھا مذہب کے نام پر۔ بابری مسجد کے وقت کی بات ہے کچھ باہری لوگوں نے ہندو مسلم کے نام پر ورغلا دیا۔ اب جان لو کہ یہ صدیوں کا نازک معاملہ ٹھہرا اور صدیوں سے بھڑکتے آئے لوگ پھر بھڑک گئے۔ دونوں بھول گئے برسوں پرانے اپنے رشتوں کو اور مار پیٹ پر اُتارو ہو گئے۔ جوان لڑکے جن کے نہ کوئی کام نہ دھندا گروہ بندی میں لگ گئے اور بھڑکانے والے نہ اِدھر کم تھے نہ ہی اُدھر۔ دونوں طرف ہتھیاروں کی ہوڑ مچنی شروع ہو گئی۔ اِن جوانوں کے من میں بھڑکی آگ کو دیکھ کے پردھان کو لگا کہ اَن ہونی ہو جائے گی۔ دنگا ہو گیا تو گھروں کے چراغ بجھ کے ماتم میں بدل جائیں گے۔ ارے بڑے طریقے سے سنبھالا بھیا اُس نے تو۔ مار کاٹ کا اندیشہ ہونے پر اُس نے کہا کہ ''جب لڑ ہی کے فیصلہ کرنا ہے تو لڑو پر خبردار کوئی باہر کا آدمی نہ لڑے گا۔ آجاؤ سارے گاؤں والے، شام کو میدان میں اب لڑ کر ہی فیصلہ لے لو۔''

''شمشیر کی بات کو سب سانس روکے سُن رہے تھے۔ جمیل کے من میں ویسی ہی اُتھل پُتھل مچ رہی تھی۔ جیسی اُس دن گاؤں بھر کے لوگوں میں مچی ہو گی۔ اُس دن شام تک کتنے گھر سہم، دہل گئے ہونگے؟ کتنی کھلبلی ہو گی، کتنی تیاریاں اور پھر جیتا کون؟ جمیل کے دِل کو قرار نہ پڑ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں

سے ''پھر کیا'' کا اشارہ پا کر شمشیر نے سانس کھینچ کر پھر دوبارہ کہانی کا سِرا آگے بڑھایا۔

''تو بھیا جہاں شام کو مارکاٹ کی بن آئی تھی وہاں اُس کا ایک دم اُلٹا ہی ہوا۔ ماں-باپ نے مصیبت کا اندازہ لگا کر دھمکا دیئے اپنے لاڈلے۔ بڑوں نے سمجھداری دکھائی زندگی موت کے برسوں پرانے ساتھ نے سب کو خبردار کر دیا، اور پھر ہائے ہتھیا سے اُجڑ جانے والے سب کے کام دھندوں پر منڈراتا خطرہ نہیں تھا کیا؟ تو پھر شام کو چڑیا کا بچہ تک میدان میں نہ دکھائی پڑا۔ پردھان کی بات کا ایسا اثر ہوا کہ سب کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ آخر کون چاہتا ہے بے بات کی لڑائی۔ روز ہندوؤں کو ہم سے کام پڑتا ہے اور ہمارا اُن کے بنا گزارا نہیں۔ اتنا پُرانا رشتہ اور لین دین ٹھہرا۔ جانتے ہو جب کام سے دلّی جاتا تھا بڑے ٹھیکوں کے لئے تو کتنے پنڈت دوست شہر آتے اور فرمائش سے گوشت پکواتے۔ خوب سیر ہو کر کھاتے تھے سب۔ بس جہانگیر آباد میں تو اُس دن سب خیریت کی اللہ اور رام نے۔ اب پھر یہ نئی مصیبت ہے گودھرا کی۔''

آخری بات کو ان سنا کرتے ہوئے جمیل کے دِل کو بڑا سکون ملا۔ ایسا حوصلہ جاگا کہ ابھی جائے اُمیش کے گھر اور اُسے پوری کہانی بتائے۔ اُس کے ذہن کو جہاں سکون ملا تھا وہیں اُس نے محسوس کیا کہ ابا پہلے سے تو ضرور کچھ ٹھیک لگ رہے ہیں لیکن اُن کی فکر اب تک ختم نہیں ہوئی ہے۔

اگلے دن پتہ چلا کہ اُمیش کئی اور لڑکوں کے ساتھ غائب ہے۔ رام پھل نے بتایا کہ اُس پر بھی ساتھ چلنے کا بڑا دباؤ تھا لیکن رام پھل پر گھر کی سیکڑوں ذمہ داریاں تھیں تو اُس نے بڑی مشکل سے جان چُھڑائی۔ گاؤں میں یوں تو سب پُرسکون دِکھتا تھا لیکن اب مذہب کی باتیں پہلے کی طرح کھل کر نہیں ہوتی تھیں۔ ایک خاموش جنگ جاری تھی جو زیادہ ہی خطرناک تھی۔ ایک بوجھل، جان لیوا سا ماحول۔ اِن دنوں پُلیا بھی جمیل کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ اُمیش تھا نہیں اور یوسف و رام پھل کے کام اچانک ہی بڑھ گئے تھے۔ یوں تو جمیل پہلے بھی کئی مرتبہ پُلیا پر اکیلے بیٹھنے کا مزہ لے چکا تھا پر اب وہی اکیلا پن ڈراتا اور ایک خوف کھڑا کرتا۔ اِس بیچ اُمیش لوٹ آیا اور دن دن بھر ہندو مذہب کے مشہور قصے سُنایا کرتا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ کسی بڑے جلسے میں شامل ہو کر لوٹا ہے۔ صرف اپنے مذہب کی بڑائی اور باقی سب کی برائی کرتا رہتا۔ جمیل جیسوں کے لئے گہری نفرت اور دشمنی اُس کی آنکھوں میں ایسے ہی نہیں تھی۔ آج کون کہہ سکتا تھا کہ یہ جگری دوست تھے کبھی؟ اب تو اُس سے آمنا سامنا ہونے سے جمیل بھی کترانے لگا۔ اُس کا کہیں دِل نہیں

لگتا تھا۔ایک دن یوسف سے بھی اُس کی اچھی خاصی کہاسُنی ہوگئی۔

''ارے چل نہ میرے ساتھ۔ جب یہ لوگ اپنا مذہب بچانے کو کود رہے ہیں تو ہمیں بھی ایک ہونا ہوگا۔ جب مار-کاٹ، آگ زنی کے الزام لگائے ہی جا رہے ہیں ہم پر تو پورا کر کے ہی دکھا دیتے ہیں .....چل نا.....ذاکر بھائی بہت سچی باتیں بولتے ہیں۔آخر کو سگے ہیں ہمارے۔چل بلایا ہے انہوں نے۔ ''

یوسف کے لفظوں سے آگ لگ گئی جمیل کے۔ذاکر کے دل میں بھرے زہر سے وہ واقف تھا ۔اور پھر ذاکر یوں بھی اسے پسند نہ تھا۔مسلمان لڑکوں کو گھیر کر اللہ کے نام پر اُن کا لیڈر بنا رہتا تھا ذاکر۔ جمیل نے یوسف کو سمجھانے کی کوشش کی۔لیکن بات ہی بات میں معاملہ بگڑ گیا۔جمیل کی مردانگی کو چیلنج کرتا ہوا یوسف اپنی راہ چلا گیا۔روز ہی ایک اداس صبح سے شروع ہوا جمیل کا دن مایوس رات پر ختم ہوتا۔جس جگہ سے دور ہونے کا تصور اس میں عجیب سی بے چینی بھر دیتا تھا، آج وہ اس جگہ سے بھاگ جانے کی سوچنے لگا ۔یہ سب کچھ جان کر ماں-باپ نے اسے رحمت کے حوالے کر دیا۔رحمت اسے دلی لے آیا۔

''دیکھو بیٹا اب جو بھی ہے یہی سچ ہے کہ تم اب طریقے سے کمانے کی سوچو۔ماں-باپ کا سہارا بنو۔رہنے ٹھہرنے کی تھوڑی بہت رقم دی ہے تمہارے ابا نے پر خود نہ کماؤ گے تو کھاؤ گے کیا اور گھر کیا بھیجو گے؟ کمرے کا انتظام کر دیں گے۔کئی لوگ ساتھ رہیں گے۔مِل جُل کے رہتے ہیں یہاں تو تم بھی رہو۔پھیری کے کام میں من لگتا ہے نا تمہارا تو ایک جگہ بات کر لی ہے۔کل لے چلیں گے۔اپنا کام سمجھو اور کرو۔کوئی پریشانی ہوگی تو ہم ہیں ہی یہاں۔''

جمیل نئی جگہ کو ابھی سمجھ نہیں پایا تھا لیکن ذمہ داری سمجھ میں آ گئی تھی۔یوں تو اس کو زندگی سے بہت زیادہ امیدیں نہیں تھیں، ہاں پُلیا پر دیکھے کچھ خواب ضرور تھے جو بڑے رنگین اور شاندار لگتے تھے۔ لیکن اب نہ تو پُلیا رہی نہ پُلیا کے خواب۔پُلیا کی تصوراتی دنیا کے برعکس آج کئی ٹھوس حقیقتیں جمیل کے سامنے تھیں۔جن کا مقابلہ اُسے اب اکیلے ہی کرنا تھا۔

''ردّی .....ی .....ی ..... پیپر'' کی آواز سے گلیوں-گلیوں گھبراتا سا گھومنے والا جمیل تھوڑے ہی دن میں سب ٹھکانوں کا عادی ہوگیا۔گھروں محلوں کی اسے صحیح پہچان ہوگئی تھی۔بھاؤ اور تول کا پکّا، دیکھنے اور سننے میں بھی اچھا اور فالتو کسی سے بولنا نہیں۔وہ گندی بستی میں رہنے کے بعد بھی صاف

ستھرا بن کے رہتا۔ روز نہانے کی عادت تو اسے بچپن سے ہی تھی، یار دوست چھیڑتے ''ارے پچھلے جنم میں برہمن رہا ہوگا تو؟'' ردی بیچنے کے اڈّے بھی اس نے جلدی ہی جان لئے۔ اس نے روز کے سامان کو روز ہی ٹھکانے لگانے کا اصول بنا لیا تھا۔ کچھ ہی برسوں میں کام جما لیا جمیل نے۔ اب وہ پیدل نہیں تھا ایک سائیکل تھی اُس کے پاس اور ہاتھ میں ایک گھڑی بھی۔ شہر کی ہوا اسے بھی چھو رہی تھی۔ جمیل کو یہ تبدیلی اچھی لگتی تھی لیکن ہوا میں بہنا اسے پسند نہیں تھا۔ شہر کا اپنا ایک الگ ہی ماحول تھا کہ کسی کو اس کے مذہب سے کچھ لینا - دینا نہیں تھا، سب کو اپنے کام سے مطلب۔ یار دوستوں کا بھی مذہب مزدوری تھا اور ذات یومیہ پگار۔ اپنے اپنے گھروں سے جدا ہو کر اب سب نے یہاں جب چھوٹے چھوٹے گھر بنا لئے تھے تو سب ہولی عید بھی مِل کر مناتے تھے۔ مذہب کے نام پر سب ایک دوسرے کا کھل کر مذاق اڑاتے اور اگر پوجا پاٹھ کا وقت مِل جاتا تو وہ بھی کر لیتے۔

''ابے پہلی شادی کب کر رہا ہے تو؟''

''کیا مطلب؟''

''پہلی کرے گا تبھی تو تین اور کر پائے گا۔ تمہارے یہاں تو کھلی چھوٹ ہے نا یار۔''

''سالے اس کمائی میں ایک کو پال لوں، تو چار کی بات کرتا ہے۔ ہم نے تو نہیں دیکھی اپنے یہاں کسی کی چار شادی۔ تو نے دیکھی ہے کیا؟'' مزہ لینے کے لئے یوں سب ہنس لیتے۔

اچانک ایک دن محلے کی پُرسکون زندگی میں ہلچل مچ گئی۔ رات ہی رات میں کسی نے کوٹھیوں کے آگے کھڑی دو بڑی گاڑیوں کے ٹائر اور ایک کا اسٹوریو نکال لیا۔ ڈاکٹر یادو کی گاڑی تو ایک دم نئی تھی تو گپتا جی کی گاڑی بھی چند سال پرانی تھی لیکن ٹائر ابھی بدلے گئے تھے۔ صبح سے ہی پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں اور پوچھ تاچھ چل رہی تھی۔ ڈیوٹی پر تعینات ایک گارڈ بھی آج غائب تھا۔

''ایک دن میں نہیں ہو سکتا یہ کارنامہ صاحب۔ بڑے دنوں کی پلاننگ ہے۔''

موقع واردات پر لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

''غلطی آپ سب کی ہے۔ میں نے کتنی بار کہا لیکن آپ لوگوں نے دھیان نہیں دیا۔ کبھی رات ہی رات میں نالیوں پر ڈھکے ڈھکن غائب ہو رہے ہیں، کبھی ایک ایک کر کے بچوں کی مہنگی والی سائیکلیں۔ پر کسی نے پرواہ نہیں کی؟ بیٹھے رہو جب تک آگ آپ کے گھر کو نہیں لگتی۔ لیکن پھر کوئی یہ شکایت

نہ کرنا کہ کوئی نہیں آیا مدد کرنے۔ہم کیا پاگل ہیں کہ آج جب کوئی ہمارا ساتھ نہیں دے رہا تو ہم کل اس کے ساتھ کھڑے ہوں گے؟ غصے میں گپتا جی کیا بولے جا رہے تھے انھیں ہوش نہیں تھا۔

سارے لوگوں کو کٹھہرے میں کھڑا کر دیا تھا گپتا جی نے، اور لوگوں پر بھی اب سماجی ذمہ داری آ گئی تھی۔لوگ کچھ کر تو سکتے نہیں تھے پر اپنی باتوں سے گپتا جی اور ڈاکٹر صاحب کو دلاسہ ہی دے سکتے تھے۔اور سب سے بڑی بات یہ کہ لوگ اس وقت اپنی پوری ہمدردی کے ساتھ کھڑے دکھائی دینا چاہتے تھے۔چوری کی اس واردات نے سب کو خبردار کر دیا تھا۔سب کو اگلا نمبر اپنی ہی گاڑی کا لگنے لگا۔

''کام تو اسی کا ہے جس نے یہاں کے گھروں کی بڑی گہرائی سے معلومات حاصل کی ہے۔ اور یہ بات بھی پکی ہے کہ گارڈ نے اس کی مدد کی ہے۔''لوگوں نے دونوں کی پریشانی کو اپنی پریشانی مان کر بولنا شروع کیا۔

''آج گاڑی پر ہاتھ صاف کیا ہے، کل گھروں پر کریں گے، دیکھ لینا۔''

لوگوں کے تناؤ اور بے چینی کے ساتھ ہی اب محلے میں آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔روز کے کام تو آخر اپنی رفتار سے چلنا ہی تھے۔پولیس تفتیش ابھی جاری تھی۔محلے میں کام کرنے والی نوکرانیوں سے لے کر دودھ، سبزی والے، گھروں میں پُتائی پتائی کرنے والے مزدوروں کے ساتھ ردی پیپر کی ہانک لگاتا جمیل بھی روز کی طرح اپنے وقت پر آ گیا۔بھیڑ بھاڑ دیکھ کر سب جاننے کے لئے وہ بھی بھیڑ کا حصہ بن گیا ۔ڈاکٹر صاحب کے رسوخ اور پولیس محکمے میں خاصی جان پہچان سے انکوائری کی نزاکت کے مدنظر پوچھ تاچھ کے لئے کچھ لوگوں کو قریب کے تھانے لے جانا ضروری تھا۔پوچھ تاچھ کے لئے کچھ لوگوں کے ساتھ جب جمیل کا نام لیا گیا تو وہ سکتے میں آ گیا۔

''میں کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟ میرا کیا لینا دینا اس سب میں؟''اس کے ذہن نے کئی سوال کئے۔لیکن جانا تو تھا ہی۔گھبراہٹ کے باوجود اس کے چہرے پر اطمینان تھا، کوئی جرم نہیں کیا تھا اس نے۔

''سوال ہی تو پوچھیں گے نا، پوچھ لیں۔میں کوئی مجرم تو ہوں نہیں۔ہاں آج کی دہاڑی مر گئی۔'' آگے کے حالات کا اندازہ لگا کر اس نے اپنے دل سے ہی سوال جواب کا خاکہ تیار کیا۔

تھانے میں تفتیش کے دوران جب جمیل کا نمبر آیا تو وہ پوچھے گئے سوالوں کا سہی سہی جواب

دے رہا تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب نے چوکی پر تعینات تھانے دار سے کہا۔

''یونو دیز پیپل .....دے آر بارن کرمنل۔'' انگریزی اس کے پلّے نہیں پڑی لیکن ہاو بھاو سے سمجھ گیا بات کچھ اس کے خلاف کہی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بات پر تھانیدار نے بڑی تیزی سے اپنا سر ہلایا اور سوال جاری رکھے۔

''تو یہ بتا کہاں بیچتا ہے اپنا مال؟ پرانا کباڑ ہی بیچتا ہے یا گاڑی کے ٹائر۔ ٹیوب بھی؟ اور یہ بتا اسٹیریو کہاں بیچتا ہے؟'' جمیل کے صحت مند جسم کو توڑتے ہوئے تھانے دار بولا۔

حیرت میں پڑے جمیل کو جیسے سنائی دینا بند ہو رہا تھا۔ اپنی پوری طاقت سے وہ اپنے کان اور دھیان سوالوں پر لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ بدن میں جیسے خون کا دوران کسی دباؤ سے رک گیا ہو اور اسے سارے حواس دم توڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ بنا ثبوت، گواہ، کورٹ- کچہری کے جمیل کو سیدھے سیدھے مجرم قرار دیا جا رہا تھا۔ اس بے عزّتی کے باوجود اُسے اپنی اکھڑتی ہوئی سانسوں کو جبراً قابو میں رکھتے ہوئے، سامنے بیٹھے لوگوں سے کوئی سوال پوچھے بغیر انہیں جواب دینا جاری رکھنا تھا۔ اس کی نظر میں یہی اس کے بے گناہ ہونے کا اکیلا راستہ تھا۔

''جی میں تو صرف ردی- لوہا، پلاسٹک ہی اٹھاتا ہوں گھروں سے.....ایسی چیزیں کہاں۔'' ٹوٹے ہوئے من سے جمیل نے کہا۔

''اور اٹھائے گا بھی تو کیا تو اتنا نیک آدمی ہے کہ ہمیں بتا دے گا؟ اور کون- کون ساتھ ہیں تیرے اس دھندے میں بتا؟'' تھانیدار کی آواز گرجی۔

ساتھ بیٹھے بیل دار پرکاش سے رہا نہ گیا۔ ''صاحب! یہ بے قصور آدمی ہے۔ میں جانتا ہوں اس کو۔ میرے ساتھ رہتا ہے۔''

مصیبت کے وقت پرکاش کے ان جملوں نے سچ مچ اندھیرے کو چیر دیا۔ مگر اگلے ہی لمحہ تھانیدار حرکت میں آ گیا۔ سیٹ سے اٹھ کر ایک بھرپور تھپڑ پرکاش کے گال پر لگا دیا۔

''ابے تو کیا راجا ہریش چندر کے خاندان کا ہے جو تجھ پر یقین کر لوں۔ اور سالے تجھے کو کون جانتا ہے یہاں؟ بہار سے آیا ہے یا یوپی کا ہے؟ تو بھی اس کے ساتھ شامل ہے کیا چوری میں؟'' پرکاش تھانیدار کا منھ تکتا رہ گیا۔ گال پہ پڑے طمانچے سے ابھر آئی لال پرتوں کے کنارے خوف کی سفید لکیر بھی

کھنچ گئی تھی۔ جمیل سب سمجھ رہا تھا یہ تھپڑ اسی کے نام کا ہے جو پرکاش کو پڑا ہے۔

لمبی، اُباؤ کارروائی سے مطمئن ہوکر ڈاکٹر صاحب چل دیئے۔ آج ہاسپٹل میں ان کی او-پی-ڈی-تھی اور گپتا جی کو بھی پولس کے سہارے نہ بیٹھ کر گاڑی درست کرانی تھی۔ تھانیدار نے اتنا سچ تو بتا دیا تھا انہیں کہ کچھ ملنے کی امید نہ رکھیں ہاں سمجھوتا اس بات پر ہوا کہ ان لوگوں کو راستے میں نہ چھوڑا جائے ان کو ملی سزا دوسروں کے لئے سبق بنے۔ کچھ مزدور بھی بھیج دیئے گئے لیکن جمیل، پرکاش اور گارڈ کو نہیں بھیجا گیا۔ بے عزتی کے ساتھ ساتھ آج کی دہاڑی مارے جانے کا بھی جمیل کو افسوس تھا۔ اور اب کل سے کون بلائے گا اسے اپنے گھر کباڑ لینے؟ اس تھو کا فضیحت سے نکل بھی گیا تو تھانے کی کہانی کئی دن چلے گی اور پھر ڈاکٹر صاحب اور گپتا جی اب کیا اسے جمے رہنے دیں گے وہاں؟ ایسے ہی نہ جانے کتنے ہی سوال جمیل پر اپنا شکنجہ کستے جا رہے تھے۔ اور سب سے بڑا سوال تو یہی تھا کہ اس بے بات کی قید سے کب رہا ہونگے؟

ان تینوں کو ایک کونے میں مجرم کی طرح بٹھا دیا گیا۔ برسوں پہلے امیش کے چہرے پر جس نفرت کو جمیل نے پایا تھا وہی آج اور دھار دار ہوکر تھانیدار کے چہرے پر اگ آئی تھی۔ ''نام''، صرف ایک نام کی وجہ سے جمیل مجرموں کا سرغنہ مان لیا گیا تھا اور اس کے ساتھ بیٹھے دو لوگ جرم کو انجام دینے والے اس کے ساتھی کے طور میں بٹھائے گئے تھے۔ اس کے من میں برسوں پہلے کی ابا کی بات لہر کی طرح اٹھی..... تقسیم۔ جب شہر آیا تھا تو اس نے سوچا تھا یہاں کسی کو کسی کے ذات مذہب سے کچھ لینا-دینا نہیں ہے۔ راجدھانی کا کھلا پن اس نے اسی روپ میں محسوس کیا اور سراہا تھا۔ پر آج کے واقعہ نے اس کے سامنے ایک بڑا سچ لا کھڑا کیا کہ باتیں جب تک ڈھکی-چھپی رہتی ہیں تب بہت دلکش محسوس ہوتی ہیں دیتا ہے۔ پردہ پلٹ دو تو ہر طرف ایک بج بجاتا نالہ ہی ہے اور کچھ نہیں۔ بے عزتی اور نفرت کی بو چھار کچھ ہلکی ہوئیں تو بھوک کی ماری آنتوں نے منھ اٹھایا۔ پر یہاں کون سنے گا؟ صبح سے شام ہونے کو آئی۔ سب تو پوچھ ڈالا، اب کیا؟ اتنے میں رحمت چاچا کے ساتھ ٹھیکے دار سنتوش آتا دکھائی دیا۔ سنتوش کا آنا-جانا ہے ان تھانوں میں۔ کہیں کوئی غیر قانونی تعمیر کرواتا ہے تو مالکوں سے تھانہ-پولس کی جھولیاں وہی تو بھرواتا ہے۔ جمیل اور پرکاش سمجھ گئے کہ یہاں سے چھوٹے مزدوروں نے ہی یہ دور کی کوڑی کھوج نکالی ہے۔ امید اور بے چینی کی کسمساہٹ ماتھے پر کھنچتی چلی جا رہی تھی۔ آخر کار وہی ہوا۔ یہاں بھی سنتوش نے پولس کی جھولی بھروائی۔ پورے دن کی ان کی ''محنت'' ضائع نہیں ہوئی اچھی کمائی ہوئی۔

''چاچا اب میں یہاں نہ رک سکوں گا۔'' شہر میں سب کچھ ختم ہوا مان کر بے چارگی کے عالم میں جمیل نے کہا''۔

''کہیں بھی چلا جا بیٹا تیرا بچ تو ساتھ چلے گا ہی۔ پھر اب گاؤں میں کیا رکھا ہے تیرے لئے؟ اور پھر شہر، یہ ہو یا کوئی اور کیا فرق پڑتا ہے تھوڑے دن میں بھول جائیں گے سب۔ تو کوئی اور محلّہ پکڑ لیو۔'' رحمت چاچا نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''لوگ بھول بھی جائیں چاچا پر کیا میں بھول سکوں گا؟'' سوال جائز تھا اور رحمت سے جواب دیتے نہ بنا۔

کچھ دن اداس رہنے کے بعد جمیل سچ مچ گاؤں چلا آیا۔ اس واقعہ کے بعد جمیل کے چند دن بے چینی میں ضرور گزرے مگر اسے یہ سمجھا گئے کہ شہر ہی اب اس کا آخری ٹھکانا ہے۔ اچھا- برا چاہے جیسا۔ گھر کی غریبی، گاؤں میں نوجوانوں کے لئے پھیلی بے کاری، روز بہ روز بڑھتی ذمہ داریوں کی سوچ نے جمیل کی ذلت کو کہیں بہت دور دھکیل دیا۔ یہ فیصلہ لینے کے بعد بھی اس کا مطمئن اور پُر سکون ہونا مشکل تھا۔ تھانے سے جان چھڑانے کے چکر میں روپے بھی کافی خرچ ہو گئے تھے۔ گاؤں واپس لوٹ کر اسے پھر ویسی راحت ملی جیسی کبھی یہاں سے شہر آ کر ملی تھی۔ وقت کی اس عجیب وغریب شکل وصورت کو وہ بنتے بگڑتے بڑے نزدیک سے دیکھ رہا تھا۔

گھر میں اس نے شہر کا سچ کسی سے نہیں کہا۔ سب نے مانا گھر کی یاد آنے کی وجہ سے جمیل واپس آیا ہے لیکن اس کی اداسی کسی سے چھپی نہ رہ سکی۔ ابا روز ہی اسے یار- دوستوں کے گھر جانے اور گاؤں کے بزرگوں سے ملنے کی بات کہتے۔ ایسا نہیں ہے کہ جمیل کو پرانے دوستوں سے ملنے میں کوئی اعتراض تھا۔ ویسے بھی جس طرح وقت کی زمین پر نکیلے پتھروں کے کونے پانی کی گود میں پڑے رہنے سے اپنا نکیلا پن کھو بیٹھتے ہیں ایسا ہی جمیل کے ساتھ ہوا تھا۔ امیش اور یوسف کی بات وہ لگ بھگ بھلا چکا تھا۔ اب تینوں گھر- پریوار والے ہو چلے تھے اور امیش آج بھی ہندو لڑکوں کے لیڈر کے روپ میں جانا جاتا تھا۔ ملنے پر سب کے بیچ کوئی کڑواہٹ کے نشان نہیں تھے بس رام پھل کو چھوڑ کر سب میں ایک جھجک باقی تھی جو پلیا کے دنوں کو ہرا نہیں ہونے دے رہی تھی۔ گھومتے ٹہلتے جمیل پلیا پر بھی ہو آیا۔ پلیا آج بھی بچوں اور جوان دوستوں کا اڈہ تھی۔ وہاں آج بھی کوئی فکر، غم، پریشانی اور تکلیف نہیں تھی بس چہرے بدل گئے تھے

۔جمیل کو لگا جیسے ان چہروں نے وقت کی دھارا کو اس کے لئے پیچھے موڑ دیا ہے۔ کچھ لمحہ ماضی میں جی کر جب جمیل لوٹا تو سب کچھ ندارد تھا۔ چہرے کی اداسی کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ ذاکر کا رتبہ بھی بڑھ چلا تھا گاؤں میں۔ ذاکر بھائی خاصی عزت سے نوازے جانے لگے تھے۔ اللہ اور ایمان کی راہ کا حوالہ دے کر اچھا رعاب جما لیا تھا انہوں نے۔ ابا نے کئی دفعہ ان سے مل آنے کی بات کہی پر جمیل کا دِل نہ مانا۔ اس کی یاد میں اب بھی ذاکر کا بچپن زندہ تھا۔ آج کے اس پُرسکون ماحول میں بھی ذاکر اور اُمیش کے اُس وقت کے چہرے یاد آتے ہی اس کا من اُچاٹ ہو جاتا تھا۔ اسے لگتا ایسے ہی لوگ ذمہ دار ہیں جو انسان کو اس کی محنت، قابلیت اور ایمانداری سے نہیں صرف اس کے مذہب سے پہچاننا پسند کرتے ہیں اور وقت آنے پر دوسرے کی پتنگ کاٹنا جن کا پسندیدہ کھیل ہے۔ اور بے رحمی و بربریت اس کھیل کے سخت قانون ہیں جس میں دوسرے کے لئے کوئی رعایت نہیں۔ شہر کے واقعہ کو جب اس سب سے جوڑ کر دیکھتا تو وہ محسوس کرتا کہ یہ چہرے وہاں بھی اسی شکل میں ہیں۔ ''آخر یہ کھیل کب سے جاری ہے؟''

جوان بیٹے کی اداسی جب کسی بھی طرح کئی دن تک دور نہیں ہوئی تو اماں کو ایک ہی ترکیب سمجھ میں آئی ''اس کی شادی''۔ شمشیر خالو نے پہلے ہی لڑکی دیکھ رکھی تھی اور وہ ماں کو پسند بھی تھی۔

''ویسے ابھی تو نہیں پر جیسا تم کہو اماں.....آج نہیں تو کل کرنی ہی ہے شادی۔'' زندگی کا ایک اور بڑا کام نپٹ جائے کچھ یہی انداز تھا جمیل کا۔ اور بات پکی ہو گئی۔

''بیٹا تو لے جانا سونی کو اپنے ساتھ شہر۔ یہاں تیرے بغیر اس کا دل نہ لگے گا۔ اور وہ یہاں رہی تو تُو بھی بھاگا بھاگا آئے گا ہر دوسرے دن۔'' شہر کے لئے نکلنے سے پہلے اماں نے جمیل سے کہا۔

''نہیں اماں وہ، کہاں؟.....تیرے پاس ہی رہے گی۔''

جمیل کا سنجیدہ اور فیصلہ کن لہجہ سن کر ریشم بھی سکتے میں آ گئی۔ لڑکے کی آواز میں شادی کو لے کر خوشی کی ایک جھلک تک نہیں ملی اُسے۔ چپ رہنا ہی اسے ٹھیک لگا اس وقت۔ جمیل کے دماغ میں اپنی ہونے والی بیوی کو لے کر پہلے بھی کوئی الجھن نہیں تھی۔ شہر کی گھنی اور گندی بستی اسے یوں بھی انسانوں کے رہنے لائق نہیں لگتی تھی۔ کام پر جانے کے بعد پیچھے ستانے والی فکر کے بارے میں بھی اس نے غور کر لیا تھا۔ اور پھر تھانے کے واقعہ نے تو اس کے فیصلے پر مہر ہی لگا دی تھی۔ گاؤں میں رہے گی تو محفوظ رہے گی وہاں کے مقابلے۔ جمیل نے پختہ ارادہ کر لیا۔

شہر آ کر جمیل نے دوبارہ کام جمایا۔ رہا جمنا پوری میں ہی پرکاش، انوکھے اور سنیل کے ساتھ بس کام کا محلّہ بدل لیا۔ ساتھ رہنے والے انوکھے نے بڑی مدد کی۔ اس درمیان جمیل کی شادی ہوگئی اور کچھ وقت کے بعد وہ ایک بیٹے کا باپ بھی بن گیا۔ اب زندگی کے سارے سُکھ اس کے حصے میں تھے۔ بات بات پر ہنستا اور بے بات پر بھی اس کی ہنسی نہ تھمتی۔ اب اسے دوگنی طاقت سے کمانا تھا۔ ایک اچھی زندگی، بھائی بہنوں کی ذمہ داری، بیٹے کی سہی پڑھائی لکھائی اور اس کے علاوہ بھی بہت سے ارمان تھے اس کے۔ سونی نے اس کی زندگی میں جوش اور خوشیاں بھر دی تھیں۔ شہر واپس آ کر جمیل نے انوکھے کی مدد سے ایک بڑی سوسائٹی کا کام اٹھالیا۔ انوکھے بھی اسی سوسائٹی میں مالی کا کام کرتا تھا۔ نئے کام کی شروعات کے ساتھ پچھلے تمام واقعات کو جمیل نے درکنار کر دیا تھا۔ بس اب اسے اپنا کام پوری ایمانداری سے کرنا تھا۔ ادھر اس نے پایا کہ راجدھانی میں الیکشن کے بعد ماحول کچھ بدل گیا ہے۔

''جے دھرتی ماں، جے گؤ ماتا'' کے جملوں پر ہلچل سی مچ جاتی سوسائٹی میں۔

''ارے گؤ-گراس والا آ گیا۔ بھاگ کے جا اور وہ رات کی روٹی دے آ۔''

اوپری منزل سے فوراً بھاگ کر نہ آ پانے والی تھل تھل کایا بی بی جی نوکرانی کو دوڑاتیں۔ آس پاس کئی لوگ بڑی پابندی سے اپنا دھرم نبھانے لگے تھے۔ جمیل سوچ میں پڑ جاتا- ہمارے گاؤں میں تو پہلی-پہلی، تازی روٹی نکال کر لوگ خود گائے کو کھلاتے تھے، بنا کسی گاڑی، بھوپو اور شور-شرابے کے۔ پر آج آنے والی یہ گاڑیاں تو تیز گانوں کے ساتھ گائے کا گن گاتی پھر رہی ہیں۔ جمیل کو سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی کہ گؤ-گراس لینے کا یہ کیسا طریقہ ہے۔ اور اگر ایسا کرنا ہی ہے تو پُرسکون طریقے سے مانگا جائے یہ دان۔ اس نے آس پاس بھی غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ گاڑیاں تو اب ہر سوسائٹی-محلّہ میں آ رہی تھیں۔ شبھ ابھیان کے نعروں، تقریروں اور گیتوں کے ساتھ۔ مندر نما شکل کی گاڑیوں میں مندر کی طرح ہی گھنٹی لگی تھیں۔ نیچے چمک دار اسٹیل کے دو ڈرم سجے ہوئے تھے۔ ایک بات اور جو وہ سوچتا کہ جو لوگ روٹی اور کھانے کی دیگر چیزیں نہ بھی دے پاتے تھے ان سب کے دماغ میں اگلے دن دان کے لئے تیار رہنے کی گھنٹی تو بج ہی جاتی ہوگی۔ یہ گاڑیاں کون سے مقصد سے آ رہی ہیں جمیل سمجھ نہیں پاتا۔ ویسے بھی ان گاڑیوں کی ڈیوٹی دلی بھر میں لگ رہی تھی۔ پچھلی سرکار نے نگر نگم کی کوڑا ڈھونے والی گاڑی 'آپ کے دروازے پر' کھڑی کروائی تھی جس کی آواز گلی محلے میں روز گونجتی تھی۔ نئی سرکار آنے کے بعد سے پُرجوش گؤ رچھک سمیتی

نے اسی طرز پر گؤ-گراس کی رکشہ نما گاڑیاں اتار دیں۔جمیل ہر دن حساب لگاتا کہ پورے دلی بھر میں ایسی گاڑیاں بنانے- چلانے کا کتنا خرچ آتا ہوگا اور ایسی ڈھیر ساری گائیں کہاں بندھی ہوتی ہوں گی جو اس کھانے کو کھاتی ہوں گی؟ اسے تو آج بھی اپنی بستی اور آس پاس کے علاقوں میں گھومتی پھرتی گائیں کوڑے کے ڈھیر میں منھ مارتی قابلِ رحم اور کمزور دکھائی دیتیں۔

سوسائٹی میں زیادہ تر خاندان ہندو تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا جمیل اپنا نام، مذہب بتائے بغیر ہی کام چلاتا۔

''رام رام جی'' جیسا اس کا تخاطب جہاں لوگوں کو ذہنی طور پر شکوک کی سرحدوں سے آزاد کرتا وہیں اس کے خود کے لئے جیسے یہ رام- نام ایک ڈھال بن گیا تھا۔اپنے بچاؤ میں ایک ہتھیار کی مانند۔ جو لوگ اسے نام سے جانتے تھے وہ اس کے اس تخاطب سے خوش ہوتے۔

'' آیا نا سہی راہ پر۔ یہاں رہنا ہے تو جیسے ہم رہتے ہیں ویسے ہی رہنا ہوگا۔ ہماری طرح رادھے- رادھے بول یا پھر جے رام جی کی۔''

باقی لوگوں کے لئے تو وہ صرف ایک کباڑ والا ہی تھا انہیں اتنی فرصت ہی کہاں تھی جو اس کا نام اور اس کے بارے میں جانتے۔زیادہ تر گھروں میں تو ویسے بھی یہ کام گھریلو نوکروں کے ہی ذمہ تھے۔ پھر تول کے پرانے ترازو بھی اب بے کار ہو کر کسی کباڑ کا حصّہ ہو چکے تھے۔سپرنگ بیلنس جیسے اوزار کی بدولت اب جلدی سے کباڑ کو بوری میں بھر کر اس میں ہک پھنسا کر بورے کو اپنی پوری طاقت سے جمیل اٹھا لیتا۔ سپرنگ بیلنس کا کانٹا کلو کے نشان کے آگے رک جاتا۔ جتنے کلو کے حساب سے طے ہوتا اتنے پیسے جمیل حساب لگا کر فوراً ادا کر دیتا۔شروع سے ہی گھلنے- ملنے کی عادت نہیں تھی اس کی۔جسم سے صحت مند دکھتا تھا پر ادھر اس نے اپنے خاص انداز سے اسے بھی کترنے کی کوشش کی دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ کر ایک فرمابردار ملازم کی طرح اور ڈھیلے- ڈھالے کندھوں میں گردن جھکا کر چلنا۔قمیض کو پینٹ کے اندر ڈال کر کبھی چست دکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔جسم کی ساری خوبصورتی کو اس انداز نے جیسے قابلِ رحم بنا دیا تھا۔کام بچا- بنا رہے، جمیل اس کے لئے بڑی ہوشیاری سے کوشش کرتا۔اس کے ایسا کرنے کے پیچھے وہ چہرے بھی نمایاں تھے جو اسے ایسا کرنے پر مجبور کرتے۔ایک کام والے کی اوقات کو اپنی بے باک نظروں سے ہر دم تولتے۔

کام سے فارغ ہوتے ہی وہ پارکوں میں کام کرنے والے انوکھے کے ساتھ بیٹھ جاتا۔انوکھے یہاں مالی کا کام کرتا تھا۔محنت سخت اور مزدوری کم۔ وہ تو ڈیوٹی کے بعد کچھ گھروں میں اس کا اپنا کام تھا گملوں کے رکھ-رکھاؤ کا،نہیں تو گزارا مشکل تھا۔ باتونی انوکھے سمجھدار تھا۔جمیل کا سرپرست بن کر رہتا تھا سوسائٹی میں۔

''کیوں فالتو کام کرتا رہتا ہے بے تو ان لوگوں کے۔جب دیکھو اوپر سامان چڑھانا ہے کباڑی والے کو بھیج دو۔ارے ذرا یہ کردے اور وہ کردے.....کسی کا وقت برباد ہو ان کی بلا سے''۔انوکھے کی اس بات سے جمیل اپنے آج میں لوٹ آیا۔

''ارے تھوڑی دیر کے کاموں کے لئے کیا گھبرانا۔اور کون سی یہ سرکاری نوکری ہے ہماری؟ دو کام فالتو کریں گے تو کوئی نہ نکالے گا اور نہ ہی غلط سوچے گا۔کیوں؟ بات کا سرا پکڑ کر جمیل نے کہا''۔

''اس غلط فہمی میں نہ رہیو تو۔جس دن نکالنا ہوگا تیرا پچھلا کیا-کرایا کچھ کام نہ آئے گا دیکھ لیو۔ تو کس لئے کرتا ہے، جانتا ہوں سب۔لیکن اب اچھائی کا زمانہ نہیں ہے پھر ہم جیسوں کی کوئی یونین-اونین کہاں جو بچالے۔ہم سے سہی تو یہ مائیاں ہیں برتن-جھاڑو والی۔ پیسے بڑھوانے ہوتے ہیں تو سب جنی ایک ہو جاتی ہیں پر ہمارا.....جانتا ہے چھتیس نمبر والوں نے دشہرے کے دن کہا بھائی راون بنوا دے بچوں کا اب بتا میں کیا راون کا کاری گر ہوں جو بنوا دوں؟ دو گھڑی ہمارا ستانا بھی انہیں برداشت نہیں۔ صاف منع کر دیا میں نے۔تو بھی کر دیا کر''۔کہنے کو تو کہہ دیا انوکھے نے پر جانتا تھا جمیل یہ سب نہیں کرے گا۔انوکھے نے بات ختم کی ہی تھی کہ جمیل کا فون بجا۔

''روشن کی طبیعت بہت خراب ہے۔بس تم آ جاؤ کسی طرح۔گردن ایک طرف لٹک گئی ہے اور کچھ نہیں کھا رہا کئی دن سے''۔فون پر سونی نے بتایا۔

سونی کے تڑپتے ہوئے لفظوں نے جمیل کا سارا چین چھین لیا۔روشن کی طبیعت اور کام کا نقصان سمیت کئی فکریں اس کے سر پر سوار ہو گئیں۔ بچے کی تکلیف سن کر پہلی فرصت میں جمیل گاؤں روانہ ہو گیا۔اپنی پہچان کے ایک دوسرے کباڑی کو کام پر لگا دیا اس نے۔سوسائٹی نے جمیل کو کام پر رکھنے سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ایک دو دن سے زیادہ کی چھٹی نہیں ملے گی۔گاؤں جا کر پایا تو واقعی بچے کی طبیعت کافی خراب تھی۔ پہلے جب بھی جمیل لوٹتا تھا تو روشن اپنی ہنسی سے اس کا استقبال کیا کرتا تھا۔ چھ-سات مہینے

کے روشن نے بولنا تو شروع نہیں کیا تھا پر اس کے با - با جیسے لفظ جمیل کو ابا سنائی دیا کرتے ۔ ہاتھوں میں اچھال - اچھال کر اپنے بیٹے سے گھنٹوں کھیلتا تھا جمیل ۔ لیکن آج اس کے آنے پر بچے میں ایک بھی ویسی حرکت نہیں دِکھی اُسے ۔ اس کے ہنستے - کھیلتے بچے کو کیا ہو گیا؟ دل - دماغ جیسے سُن پڑ گئے تھے جمیل کے ۔

''ارے تو گھبرا مت، بچے دانت نکالتے ہیں تو ایسی پریشانی آتی ہی ہے ۔ پہلا بچہ ہے نا اس لئے زیادہ پریشان ہو رہی ہے سونی، ویسے مزار پہ جا کر جھاڑا تو میں لگوا لائی ہوں''۔ اماں فکر مند ہوتے ہوئے بھی اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں ۔

''کل چلیں گے اسے بڑے اسپتال لے کر''۔ گاؤں کے علاج سے کوئی خاص فائدہ نہ دیکھ کر اس نے جلدی سے فیصلہ لیا۔

اگلے کئی دن اسپتال میں ڈاکٹر کو دکھانے میں نکل گئے ۔ لمبی لائنوں میں لگنا، ٹیسٹ کے لئے بھٹکنا، دوائیوں کے لئے دوڑنا پڑا اسے ۔ روپیہ تو خرچ ہو رہا تھا لیکن بچہ سہی ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔ پتہ نہیں ڈاکٹر ٹھیک سے دیکھ بھی رہا ہے یا نہیں ۔ آخر ڈاکٹر نے بتایا دماغ سے نیچے آنے والا کوئی پانی جسم میں نہیں پہنچ پا رہا ہے ۔ کوئی نلی لگانی پڑے گی چیر کر، تب ٹھیک ہوگا بچہ ۔ گھر میں آپریشن کے نام پر کہرام مچ گیا ۔ اماں - ابا ماننے کو تیار ہی نہیں تھے کہ ایسی بھی کوئی بیماری ہوتی ہے ۔

''ٹھگ رہا ہے ڈاکٹر ۔ ہم نے تو اپنی پوری زندگی میں ایسی بیماری نہ دیکھی کسی بچے کی ۔'' اماں بولیں ۔

''بیٹا دلی لے چل ایک بار وہاں ہی دکھا لیتے ہیں ۔'' ابا نے کہا ۔

دلی کے اسپتالوں کے جنرل وارڈوں کی اصلیت جمیل جانتا تھا ۔ لمبے انتظار اور مہنگے علاج ۔ کہنے کو تو سرکاری ہیں پر ٹیسٹ کے پیسے کیا کم ہیں وہاں؟ مگر بیٹے کی حالت دیکھتے ہوئے اسے دلی جانا ہی ٹھیک لگا ۔ اگلے دن جانے کی تیاری ہو گئی پر اسی رات روشن چل بسا ۔ سونی کے ساتھ جمیل بھی پاگل سا ہو گیا ۔ بچے کے دُکھ نے توڑ دیا اسے ۔ سارے خواب، ساری امیدیں مٹی میں لپٹی بے رونق ہو گئیں اس مٹی میں جس میں روشن خاموش لیٹا تھا ۔

وہ بار - بار خود سے یہی سوال کرتا ''میں نے کیا بگاڑا تھا کسی کا، جس کی یہ سزا مجھے ملی ۔'' مگر جواب ندارد رہتا ساری سمتیں عجیب سے سناٹے میں ڈوبی محسوس ہوتیں اور اس سناٹے کے بیچ کبھی - کبھی لگتا روشن گھر کے کسی کونے میں پہلے کی طرح ہنس کھیل رہا ہے ۔ جیسے ابھی سونی گود میں لے جائے گی

اسے،اور روشن، با-با کرتا لپکنے لگے گا اس کی طرف۔اس سناٹے کو فقط سونی کی سسکیاں اور تیزی سے اٹھنے والی چیخیں ہی توڑا کرتیں اور اس کے بعد پھر سے ایک لمبا سناٹا گھر بھر میں چھا جاتا۔

جمیل کی زندگی کا گرتا اٹھتا گراف یوں تو پہلے بھی اسے توڑتا آیا تھا لیکن پھر ایک نئے جذبے کے ساتھ کھڑے ہو جانا اس کی فطرت میں تھا۔چوٹ لگتی تھی زخمی بھی ہوتا تھا لیکن مرہم پٹی کے بعد ٹھیک اور پہلے جیسا ہو جاتا۔پرانے روگ اور غم پالنے کی فرصت بھی اب کہاں تھی اسے۔زندگی کو رنگ بدلتے دیکھتا اور خود بھی بدلنے کی کوشش کرتا۔لیکن اس بار سنبھلنا مشکل ہو رہا تھا۔

''بیٹا تو ہمت ہارے گا تو سونی کیسے زندہ رہے گی؟ مرد کا کام ہے حوصلہ دینا،عورت کو سنبھالنا۔ اولاد کا دکھ تو دونوں کو ایک جیسا ہے بیٹا پر اس نے جنم دیا تھا روشن کو۔اس کے دکھ کی تو سوچ۔جانے کیا کیا سوچتی ہوگی۔.....اور اوپر والا ہے نا بھروسہ کر.....جیسے لیا ہے ویسے دوبارہ دے گا بھی۔'' ماں نے اشاروں میں بتا دیا کہ بہو امید سے ہے۔اس کے جملوں میں جانے کون سا مرہم تھا کہ زخم ہرے ہونے کے باوجود کم دکھ رہے تھے۔جمیل درد کی تمام حدوں کو پھاند کر پھر کھڑا ہو گیا کچھ دن سونی کے ساتھ گزرے۔زندگی پوری طرح نہیں ادھوری ہی سہی، پرانی شکل میں لوٹنے لگی۔ادھر جمیل کی بچائی رقم خرچ ہو گئی تھی اب اسے دو دو مورچے سنبھالنے تھے گھر اور گھر کے لئے پیسہ۔اسے شہر آنا ہی تھا۔

''نہیں صاحب ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنے برس خدمت کی ہے آپ لوگوں کی۔مصیبت کے مارے کو اور نہ مارو صاحب۔'' جمیل لگ بھگ گڑگڑا رہا تھا اپنے کام کے لئے۔

''دیکھ بھائی،تو اتنے سال سے ہے نہ یہاں کبھی مانگا تجھ سے کچھ؟ بول؟ اب تو اتنا کماتا ہے کہ گاؤں جا کر ٹھاٹ سے رہتا ہے۔مکان-دکان بھی بنایا ہی ہوگا۔سال کے بیس ہزار ہی تو دینے ہیں بس اور کون سا تجھ اکیلے سے مانگ رہے ہیں۔اب یہاں سب کی ہی داخلہ فیس ہے اور ہم کون سا اپنی جیب میں رکھیں گے سوسائٹی کے کاموں میں لگے گا سارا پیسہ۔'' سوسائٹی کے نئے پردھان نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔''

غریب آدمی ہوں صاحب۔سال میں لاکھ روپیہ کما سکوں گا تبھی تو دے پاؤں گا بیس ہزار .....پر اتنی کمائی کہاں ہے میری.....۔''

''وہ تو جان اور پھر یہ بھی تو دیکھ کتنا محفوظ ہے تو یہاں.....تو ہمارے پاس.....دیکھ نہیں

رہا اتنے سال سے...... کیوں جمیل؟'' جمیل لفظ پر سارا وزن ڈالتے ہوئے پردھان نے اس کے حصے کے سچ کو بیان کر دیا۔ کمیشن اور جمیل نام کے آدمی کی حفاظتی رقم دونوں ہی موضوع نئے پردھان کی لسٹ میں تھے۔

یہاں آنے پر جمیل نے سارا ماحول بدلا ہوا پایا۔ سوسائٹی میں کام کرنے آنے والوں کے لئے داخلہ فیس کا فرمان جاری ہونے والا تھا۔ کئی دن سب پر تلوار لٹکتی رہی۔ جمیل کا دِل چاہا کہ بھاگ جائے کسی ایسی جگہ جہاں کوئی دقت نہ ہو پریشانی نہ ہو پر جانتا تھا کہ ایسی جگہ نہ کہیں تھی نہ ہوگی۔ سوسائٹی کے کچھ لوگوں کی مداخلت سے کئی دن بعد مسئلہ حل ہو گیا۔ ایک بیچ کا راستہ نکالا گیا کہ سوسائٹی کو پیسہ دینے میں معزور مزدوروں کو اب ہفتہ میں کچھ گھنٹے یہاں کے کام دھام کرنے ہوں گے بنا کسی آنا کانی کے۔

''دیکھ لیا سب، کرو اب زمیندار کی بیگاری۔ ادھر سے نہ سہی تو اُدھر سے کان تو اُمیٹھ ہی لیا نا۔ ......اور جمیل تجھے بچانے کون سالا آئے گا بتائے ذرا؟ یاد نہیں ہے کیسے نکلا تھا تو پرانے محلّہ سے؟ کسی ایک نے بھی کیا تھا تیری نیکی کا بکھان؟ بڑے آئے پیسے مانگنے والے۔'' انو کھے چپ نہ رہا۔

بیٹے کے دکھ اور ایک نیا آسمان ٹوٹنے کے بعد بہت بڑی راحت محسوس کر کے جمیل نے کہا۔'' اس میں کیا ہے انو کھے، جہاں ایک گھنٹہ بعد آتے تھے تو ایک گھنٹہ پہلے آ جائیں گے۔ تو نہ گھبرا......سوچ کہاں سے لاتے اتنا روپیہ اور پھر نکالے جانے پر کہاں جا کر کام ڈھونڈتے؟''

بندھی بندھائی نوکری نہ ہوتے ہوئے بھی مالی، کباڑی، گاڑی دھونے والے، بجلی مرمت والے اور مستریوں کے لئے یہ سوسائٹی ہی کمائی کا ذریعہ تھی۔ جیسے۔ تیسے سب نے نئے حالات کو قبول کر لیا۔ کام کی مارا ماری کے ان مشکل دنوں میں زیادہ تر کو تو اس میں کسی ظلم کی کوئی بو ہی نہیں محسوس ہوئی۔ محنت کے کچھ گھنٹے اور بڑھ گئے تھے مگر پگار اتنی ہی رہی سب کی۔ دن بیتنے پر انو کھے جیسے مزدوروں کی یہ خلش بھی دور ہو گئی۔ گؤ۔ گراس کے رکشہ سے مقررہ وقت پر تیز آواز میں روز کا گیت آج بھی چل رہا تھا۔'' ہے دھرتی ماں، ہے گؤ ماتا...... گونج رہا ہے منتر مہان......

پورا سپھل ہو شبھ ابھیان......جیو ماتر کا ہو کلیان۔''

اب جمیل اور بھی ذمہ داری سے کام کرنے لگا۔ ردی کے اپنے کام سے فرصت ملتے ہی روز آنا اسے کسی نہ کسی کام سے دوڑنا ہی پڑتا۔ کبھی کسی آفس چیک جمع کرانے تو کبھی کسی کے ذاتی کام سے۔

شام کے وقت بھی کئی بار مصیبت پیش آ ہی جاتی جب اسے اپنے کباڑ کو ٹھکانے لگانا ہوتا۔ پر جمیل اُف نہیں کرتا۔ ایک جمیل ہی کیا سبھی ملازم انہیں حالات سے گزر رہے تھے۔ کام کا طوفان جب گزر جاتا تو لمحہ بھر کی فرصت میں ننھے روشن کا چہرا اس کی آنکھوں میں گھوم جاتا۔ سونی سے بھی لگ بھگ روز ہی بات ہوتی تھی اس کی۔ اسے موبائل خرید کر دے آیا تھا اس لئے سونی بھی اکثر بات چیت کر لیتی۔ اس کی زچگی کے دن بھی پورے ہونے والے تھے۔ جمیل کو فکر ستاتی رہتی۔ یوں اماں پوری دیکھ بھال کر رہی تھیں لیکن جمیل ہر بار انہیں سونی کا دھیان رکھنے، ڈاکٹر کو دکھانے اور ڈھنگ کی خوراک دینے جیسی ہدایتیں دیتا رہتا۔ سونی سے وعدہ کیا تھا اس لئے وقت سے پہلے ہی جمیل گاؤں پہنچ گیا۔

''ہاں بھائی ہم پہ بھروسہ کہاں تھا تجھے کہ خیال رکھیں گے تیری بیوی کا؟ اب سنبھال لے تو۔''

بیٹے کا مذاق اڑاتے ہوئے اماں نے کہا تو جمیل، ابا کے سامنے ذرا شرمایا پر زبان تک آئے اس کے الفاظ بے ساختہ نکل پڑے ''اماں زندگی بھر کا ساتھ ہے میرا-اس کا، نبھانا تو پڑے گا ہی۔''

اور جمیل-سونی کی گود میں پھر ایک بچہ تھا۔ صحت منداور خوبصورت۔

''دیکھ سونی بالکل روشن پر گئی ہے نا اپنی بٹیا؟''

سونی حیران رہ گئی، اکثر بچے کی شکل دیکھ کر ماں-باپ یہی دیکھتے ہیں کہ ایک دوسرے میں سے کس پر گیا ہے یا پھر ننھیال-ددھیال میں کس کی شکل سے ملتا ہے پر جمیل.....وہ تو الگ سی ہی بات کر رہا تھا۔ اس کی خوشی تھم نہیں رہی تھی۔

''اس کا نام روشنی رکھیں گے سونی.....روشن جیسی روشنی۔ تو دیکھنا میں خوب محنت کروں گا اس کے لئے۔ تھوڑی بڑی ہو لینے دے تجھے اور اسے شہر لے جاؤں گا وہیں پڑھاؤں گا، کسی اچھے اسکول میں۔ مدرسے نہیں بھیجوں گا شمشیر خالو کی طرح۔''

''جاؤ رہنے دو پورے خاندان میں کوئی لڑکی بڑے شہر کے اچھے اسکول میں گئی ہے کبھی؟''

اِٹھلاتے ہوئے سونی طعنہ ضرور مارتی لیکن اندر سے جانتی تھی کہ جمیل بات کا پکا ہے۔ پھر اپنے چھوٹے سے گھر کا تصور اس کے دل میں خوشیاں بھر دیتا۔

بٹیا کو چھوڑ آئے جمیل کا من گاؤں میں ہی اٹکا رہ گیا۔ جب بھی موقع پاتا انوکھے کو یا کمرے میں لوٹنے پر پرکاش اور سنیل کو اس کی باتیں بتاتا۔

''ابے پگلا گیا ہے۔ہم بھی باپ بنے ہیں،تو کیا نرالا باپ بنا ہے؟'' سب اسے چھیڑتے لیکن اس چھیڑ- چھاڑ میں جمیل کو اور مزہ آتا۔

جمنا پوری کی اس بستی میں جمیل نے ٹھیک ٹھاک کمرا دیکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ یوں بستی کچی تھی اور گندی بھی لیکن کام کی جگہ سے نزدیک تھی۔ سائیکل سے آنے جانے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ آگے کا منصوبہ بنا کر اپنے کام کو بھی اس نے بڑھا دیا۔ پرانا گھریلو سامان بھی اب وہ خریدنے اور بیچنے لگا۔ دھندے کے کچھ لوگوں سے سہی جان پہچان ہو گئی تھی تو اس کی ہمت بڑھ گئی۔ پرانا فرنیچر، کمپیوٹر، ٹی۔وی، ٹیپ رکارڈر وغیرہ بجلی کا سامان سب لینے لگا کباڑ میں۔ یوں گھروں کو وقت کے مطابق نیا بنوانے والے لوگ پرانی چوکھٹیں، گرل، گھن کھائے یا پانی میں پھول گئے دروازے، جالی کی بے کار ہو چکی کھڑکیاں وغیرہ بکوانے کے لئے اسے ہی بلاتے۔ لوگ پرانے سامان سے اکتا کر نئے سامان کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اب بھاری اور مضبوط کا نہیں بلکہ ہلکے اور خوبصورت فرنیچر کا چلن تھا۔ پرانا ٹکاؤ سامان جسے قریبی رشتے دار بھی نہیں لینا چاہتے تھے جمیل اس پریشانی کا حل جلد نکال دیتا۔ اس سے اس کی ساکھ بھی بن رہی تھی اور پیسہ بھی۔ اخبار، لوہا-لکڑ اور پلاسٹک اب بھی وہ خریدتا تھا پر اب وقت کے مطابق اپنے کو بدل کر دھندے کو اس نے پھیلا دیا تھا اور خوش تھا۔ جب بھی گھر جاتا روشنی کے لئے اچھے- اچھے کھلونے اور کپڑوں کی خریداری کر کے ہی جاتا۔ اماں- ابا بھی خوش تھے۔

اس بار گاؤں سے آیا تو اس کا پکّا ارادہ تھا کہ اب کوئی کمرہ ٹھیک کر کے سونی اور روشنی کو یہاں لے آئے گا۔ بچی کی تربیت کی بنیاد ہی صحیح پڑے گی تو ہی زندگی بھر اچھی رہے گی، اس نے سوچا۔ اور پھر کمرہ انوکھے اور پرکاش کے بغل میں ہی لے گا۔ دُکھی بیماری کے وقت کے ساتھی یہ ہی تھے اس کے اس شہر میں۔ جمیل یہ سب سوچتے ہوئے اپنے دوستوں سے ساری باتیں ضرور بیان کرتا تھا۔ انوکھے کے ساتھ تو آنا- جانا اور کام کی ایک جگہ ہونے کی وجہ سے چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا ہی اس کا۔

''اس بار تو چلنا انوکھے عید پہ میرے گاؤں۔ قسم سے یار گھر میں گھستے بس نام بتا دِیوا اپنا پھر دیکھنا کیسی خاطر ہوگی تیری۔ سب جانتے ہیں تجھے۔'' جمیل بولا۔

''تو تو نے سب بک دئی ہے وہاں۔'' ٹھیٹھ انداز میں انوکھے نے کہا۔

دونوں نے تیز قہقہہ لگایا۔ اگلے ہی پل انوکھے بولا-''کہاں فرصت ہوگی مجھے دیوالی پر۔ سو

کام ہوتے ہیں۔سال بھر کا تیوہار تھکا مارتا ہے۔گھر پہونچتے ہی سارے گھر کی پتائی میں لگ جاتا ہوں۔ بیٹھنے نہیں دیتی تیری بھابھی ذرا سی دیر کو۔پھر کام پر نہیں لوٹنا ہے کیسے آؤں گا تو ہی بتا؟''

''ارے بریلی سے کھتولی ذرا سی دور ہے۔تو میرے گھر عید منا کر اپنے یہاں دیوالی منا لینا یا لوٹتے وقت گھر آجانا، دونوں ساتھ لوٹ لیں گے۔''

تھوڑی آنا-کانی کے بعد انوکھے مان گیا۔جمیل نے سوچا سنگ ہی سونی اور بیٹی کو بھی لیتا آؤں گا۔ایک ساتھی ہوگا تو بڑی آرام رہے گی۔

صبح کام پر جاتے وقت دونوں نے دیکھا راستے میں بڑی چہل- پہل تھی۔پاس جانے پر معلوم ہوا یہاں ماتا کی چوکی بٹھائی جا رہی ہے۔کئی پُر جوش نوجوان ماتھے پر سنہری گوٹ کی لال چنّی باندھے ٹینٹ والے سے کام کرواتے ہوئے بھاگ دوڑ میں لگے تھے۔ان کی آوازیں خوب کھلی ہوئی تھیں۔پٹری اور سڑک پر بھی چوکی کا سامان بکھرا پڑا دیکھا انہوں نے۔شاہراہ سے قریب ہونے کی وجہ سے ٹریفک وہاں سے ترچھا ہو کر گزرنے لگا۔سب کو خاصی دقت ہو رہی تھی۔پر مذہب کا کام تھا تو سب کو پریشانی بھی منظور تھی۔لڑکوں کے تندرست وتوانا جسم اور گرجتی آواز نے کسی کو شکایت کرنے کی کوئی چھوٹ بھی نہیں دی تھی۔

شام تک دونوں اپنے اسی پرانے راستے سے لوٹے تب تک ماتا کا بھون پورا سج کر تیار تھا۔ چار میزوں کو جوڑ کر ماتا کا بھون سجایا گیا تھا۔بڑی سی چمکیلے رنگ والی مورتی کے سامنے ماتا کا شیر بھی براجمان تھا۔اسٹیریو پر تیز آواز میں بھجن چل رہے تھے۔فلمی گیتوں کی دھنوں پر کچھ لڑکے بچے ناچ رہے تھے۔ان کا ناچ بھی فلمی ہی تھا، جیسے وہ بول پر نہیں دُھن پر ہی تھرک رہے ہوں۔انوکھے اور جمیل نے ماں کے وقتی مندر کے آگے سر جھکایا لیکن سائیکل کا ہینڈل نہیں چھوڑا۔دن بھر کے تھکے ہونے کے بعد ابھی کھانا بھی بنانا تھا اور پھر اگلے دن کام پر جانے کے لئے سونا بھی ضروری تھا ان کا۔ویسے بھی چوکی، جاگرن تو اب آئے دن کی بات ہوگئی ہے۔''روز روز اگر ان میں جانے لگے تو کام کیا خاک کریں گے''-انوکھے ناستک نہیں تھا پر اس معاملے میں ایک دم صاف تھا۔چوکی سے کمرا پاس ہونے کے باوجود جمیل کے تینوں ساتھیوں میں سے کوئی بھی وہاں نہیں گیا۔

اگلے دن کام پر جاتے ہوئے دونوں نے دیکھا چوکی آج بھی کل کی طرح ہی سجی ہے۔ہاں

جھا کیاں شاید اور سجا دی گئی ہیں۔آج بھیڑ کل سے زیادہ تھی اور اسٹیریو بھی تیز آواز میں بج رہا تھا۔ساتھ میں ایک ٹیبل اور لگا دی گئی تھی۔ نئے دیوتاؤں کے روپ میں گنیش،شیو جی کے ساتھ وراجمان تھے۔دائیں -بائیں اور سامنے کی چھوٹی -سی جگہ میں بھکتوں کے لئے دریاں بھی بچھا دی گئی تھیں۔ان پر رکھی چادروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ رات کو کئی لڑکے یہیں سوئے ہوں گے۔

اب تو دونوں لوگ آتے -جاتے روز ہی ماتا کے بھون میں کوئی نا کوئی نیا بدلاؤ دیکھتے۔چوکی کے بھون پر لگے بجلی کے لٹو کھینچ کر آگے بنی مسجد کے قریب تک لے جائے گئے تھے۔پہلے سادہ سا دکھنے والا بھون اب بہت شاندار ہو گیا تھا۔رات میں کئی بھجن -منڈلیاں بھی جُٹ جاتیں ایسا سنیل نے سب کو بتایا۔ سنیل تو چوکی کی آرتی میں ایک دن شامل بھی ہوا۔بس تبھی سے پڑا تھا سب کے پیچھے-''دیکھ لو رات کو ایک دن آرتی۔اتنے قریب میں ہونے کا کچھ تو فائدہ اٹھا لو۔''

انوکھے نے سوچا ایک دن سبھی ساتھ چل پڑیں گے، ویسے بھی چوکی کا پروگرام کچھ دن آگے کھسک چکا تھا،اس کی خبر اسے بھی مل گئی تھی۔سنیچر کو شروع ہوئی چوکی کو کل ہفتہ پورا ہونے والا تھا۔صبح وہاں سے گزرتے ہوئے انوکھے اور جمیل نے دیکھا کہ آج بات کچھ اور ہی ہے۔آٹے -آلو کی بوریاں،تیل کے کنستر،مسالے بھی چوکی کے گھیرے میں پڑے ہیں۔اور دو حلوائی بڑے -بڑے پتیلوں -کڑاہوں کو دھوتے پیچھے کی طرف بھٹی سلگا رہے ہیں۔

''لے بھائی آج تو بھنڈارا ہوگا۔دوپہر میں پوری -آلو کی سبزی ملے گی۔ہو سکتا ہے حلوا بھی۔''انوکھے نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو جانہیں رہا تھا نا چوکی میں،تو لڑکوں نے آج تجھے بلانے کا پکّا انتظام کر دیا۔''جمیل نے چٹکی لی۔دونوں نے طے کیا کہ آج کھانے کے وقت یہیں آجائیں گے۔

بھنڈارے کے وقت پہونچے تو ماحول میں عجیب -سی کشیدگی کا احساس ہوا۔لائن کافی لمبی تھی اور لائن میں لگے لوگوں سے ہی پتہ چلا۔

''دن میں بہت پولیس آئی تھی مسجد کے پاس۔ایک دن کی چوکی طے ہونے کے بعد اب ہفتہ سے اوپر اکّیس دن کی چوکی بٹھا دی گئی ہے۔''کسی نے بتایا۔

''ان ٹھلوؤں کو کوئی کام -دھندا نہیں ہے کیا؟ اکیس دن جمے رہیں گے یہاں؟.....ہمیں تو

کام سے منٹ بھر فرصت نہیں۔ بھگوان کو ہم بھی مانتے ہیں پر ہمیں فرصت نہیں ملتی پوجا- پاٹھ کی۔ آج بھنڈارا کھانے آئے ہیں، کھا کر نکلیں گے کام پر۔'' انوکھے چُپ نہ رہ سکا۔

''ہم بھی تم جیسے ہیں بھائی۔ پر اصل بات یہ ہے کہ مسجد کے ٹھیک بغل میں ماتا کا مندر بنایا ہے۔ اور دھیرے- دھیرے مسجد کی طرف سرکتے آ رہے ہیں۔ ارے کہیں اور بنا لیتے۔ ایسے میں نہ ان کے بھجن سنائی پڑیں گے نہ ان کی آذان۔ گھال-میل سے دونوں کو پریشانی ہوگی، دونوں بھڑکیں گے۔'' کوئی بولا۔

''ہاں مسجد تو پکّی ہے اور کتنی پرانی بھی، مندر کہیں اور بنا لیتے نا۔'' جمیل کا یہ کہنا تھا کہ آگ لگ گئی۔ پاس سے گزرتے کسی سیوک بھکت کے کانوں میں پڑتے ہی دھماکہ ہو گیا۔

''ہمارا کھا کر ہمیں گالی دینے والا تو کون ہے بے؟.....ہم کیوں سرکائیں مندر؟ اتنی پریشانی ہے تو لے جائیں وہ اپنی مسجد کہیں اور۔ ہمارا مندر یہیں بنے گا اور جتنے دن چاہیں گے رہے گا۔ انکے باپ کی نہیں ہمارے باپ کی زمین ہے۔ گاڑ دیا ہے ہم نے تمبو۔، دکھائے کوئی اکھاڑ کر۔''

بھکت نے طیش میں غصّہ، نفرت اور اپنے ادھیکار کا اظہار کیا۔ اس کے کئی ساتھی بھی نزدیک آ گئے۔ انوکھے نے چُپ رہنے کا اشارہ کیا جمیل کو۔ بھلا ہوا جو یہ لڑکے نہیں جانتے تھے کہ جمیل کا دھرم کیا ہے۔ جمیل کا من رکنے کا قطعی نہ تھا پر انوکھے نے اسے روکے رکھا۔ اُدھر مسجد کے پاس بھی بھیڑ جمع ہو گئی۔ کئی لوگ چوکی کے شور- شرابے اور بد انتظامی سے خفا ہو رہے تھے۔ دونوں طرف کشیدگی تھی اور بیچ میں بھنڈارے کی بھیڑ میں دونوں طرف کے لوگ۔ مسجد کے پاس کھڑے لوگ اپنے مذہب پر سیدھے حملے کی وجہ سے پریشان تو تھے ہی انہیں آج کے جمعہ کی نماز کی بھی فکر تھی۔ یہاں بھی نماز کے لئے بھیڑ جمع ہونا شروع ہو رہی تھی۔ بھنڈارے کی بھیڑ سے انہیں نماز ادا کرنے کی جگہ نکالنے میں مشکل آنے لگی۔ برسوں سے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ جمعہ کی نماز میں جگہ کم پڑی ہو۔ مگر لگ رہا تھا آج ایسا ہوگا۔ جمیل نے سوچا آج کھانے کے بعد وہ بھی نماز ادا کر لے گا پر ماحول کی نبض تیز ہوتی جا رہی تھی۔

مسجد کی طرف سے آئے غصہ لوگوں نے بھنڈارا جلدی نبٹانے کی بات کہی تو ہوا میں زہر پھیل گیا۔ بات بھدّی گالیوں سے ہوتی ہوئی سیدھے طور پر فرقہ وارانہ رنگ لے بیٹھی۔ اپنے- اپنے مذہب کی پیروی میں جس کے من میں جو آ رہا تھا وہ بکے جا رہا تھا۔ 'ہماری مسجد پرانی ہے..... ہمارا مندر یہیں رہے گا

-' جیسے جملے ہوا میں تیرنے لگے۔ کشیدگی کے ماحول کو بھانپ کر جمیل نے وہاں سے نکل چلنے کے لئے انوکھے کا ہاتھ دبایا۔ پر انوکھے نہیں ہلا۔ تھوڑی دیر میں آگ ٹھنڈی پڑی پر اسے پُرسکون نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مسجد سے آئی بھیڑ ابھی واپس لوٹی ہی تھی کہ ماتا کے بھون کے پاس گوشت کا ٹکڑا پھینکے جانے کا شور مچ گیا۔ پر اب کی بار یہ شوریوں ہی نہ تھما۔ چوکی کے نجس ہونے کے ساتھ بھکتوں کی عقیدت کو ٹھیس پہونچی تھی۔ نہ کسی نے گوشت کے ٹکڑے کو دیکھا، نہ تفتیش کی اور سیلاب مسجد کی طرف بڑھ چلا۔ اس سے پہلے کہ لوگ کچھ سمجھ پاتے یا حفاظت کی جگہ پہونچتے، پتھر بازی شروع ہوگئی۔ معمولی پتھر نہیں بھاری- بھرکم اینٹیں۔ بھنڈارے کی جگہ لگی بھیڑ میں بھگدڑ مچ گئی۔ کئی بچے، آدمی اور عورتیں روندے، کچلے چلے جا رہے تھے۔ لوگ بے تحاشا بھاگ

رہے تھے.....لوگ بے مقصد مر رہے تھے۔ مذہب کے نام پر سب جائز تھا جیسے۔

پتھر بازی جاری تھی۔ بھیڑ اندھی ہو چلی تھی، مندر- مسجد بھی دِکھ نہیں رہے تھے بس بھیڑ کے دو چہرے تھے جو ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ پہلے مار کر کون جیتتا ہے اسی کی ساری لڑائی تھی۔ پورے عملے کے ساتھ پولس بھی آ گئی اب تک۔ ماتا اب بھی اس تباہی کو دیکھ کر مسرور انداز میں تھیں۔ اسپیکر کہیں ٹوٹا پڑا تھا۔ مسجد کے آگے کُرسیا کی ٹوپیاں بکھری پڑی تھیں وضو کے لئے پانی کے جگ دبی- کچلی حالت میں جہاں- تہاں پڑے تھے۔ اور کئی جسم کبھی نہ اٹھ پانے کی حالت میں اینٹوں کی گرفت میں تھے۔ سڑک کا سارا ٹریفک خوف زدہ حالت میں سمٹا اور سہما تھا۔ سڑک کے دوسری طرف بھیڑ سے بچ کر بھاگے لوگوں کا مجمع تماش بینوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ سب اپنی جان بچنے کا شکر منا رہے تھے اور کئی اپنوں کو ڈھونڈ پانے میں بے بس ہو کر خوف سے چیخ رہے تھے۔ سڑک لہو- لہان تھی۔ پلیٹیں، پوریاں سڑک پر دھول پھانک رہی تھیں۔ سڑک پر پلٹ گئے سبزی کے پتیلوں سے بہہ رہی سبزی خون کی رنگت میں تر تھی۔ کتنے ہی لوگ زخمی، بے ہوش پڑے تھے۔ کرفیو لگا دیا گیا۔ پولس نے موقعۂ واردات کی چھان بین کی۔ دیر تک جاری اس تحقیقات کا سچ کافی دن بعد سامنے آیا۔ کچھ باہری لوگوں نے اس کام کو انجام دیا تھا۔ جمنا پوری کا یہ پہلا دنگا تھا۔ ٹی- وی چینلوں پر فرقہ واریت پر کچھ تبصرہ ہوا۔ نیتاؤں نے امن بنائے رکھنے کی اپیل کی۔ گیارہ لوگ مارے گئے۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں کی لسٹ بنائی جا چکی تھی۔ مہلوکین کے ورثہ کو تین- تین لاکھ اور زخمی ہونے والے کو پچاس ہزار روپے معاوضہ دیا گیا۔

سوسائٹی میں اس دن کپور صاحب کے گھر صبح سے ہی جمیل کی ضرورت آن پڑی تھی۔ کوئی بہت ضروری کام تھا۔ اس کے آنے کے وقت کا حساب لگا کر مسٹر کپور نے گارڈ روم میں فون لگایا۔

''گارڈ، سنو ۱۰۲ نمبر سے بول رہا ہوں، جمیل آئے تو فوراً بھیجنا......سب سے پہلے میرے گھر۔ سمجھے؟''

''سمجھے'' لفظ کی تاکید سمجھ کر گارڈ فوراً بولا ''سر جی، جمیل اور انوکھے کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ کئی دنوں سے غائب ہیں دونوں۔''

گؤ - گراس لینے کے لئے آنے والی گاڑی اپنے وقت پر سوسائٹی میں داخل ہو رہی تھی۔ تیز موسیقی کے ساتھ گیت بج رہا تھا۔ ''جے دھرتی ماں...... جے گؤ ماتا...... جے گؤ ماتا، جے گؤ ماتا۔''

☆☆☆